

کالم نگار کا منصب

منیر سامی

ایک فارسی مصرعہ ہے، ”کسے کہ کشتہ نہ شد، از قبیلہء مانینست“۔ مقررہ روایت فیصل کی کتاب ”روٹی کھاتی مورتیاں“، کی اس تقریب میں یہ مضمون تحریر کرتے وقت مجھے یہ مصرعہ بھی یاد آیا اور پاکستان کی صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ اپنے سر اپنے ہاتھوں پر لیئے منصب صحافت کی سر بلندی کے لیے راہ، جنوں میں سرگرداں، ضمیر صحافت، ضمیر نیازی بھی یاد آئے، اور میں نے ضروری جانا کہ آج کی بات کا آغاز ان کی کچھ باتوں سے کیا جائے۔ ضمیر نیازی، ”ذرائع ابلاغ اور سماجی ذمہ داری“ کے عنوان کے تحت ایک مضمون میں لکھتے ہیں، ”۔۔ ذرا اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں۔۔ خبریں اور خبر نامے تو بے خبری پھیلا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اطلاعات کی بھرمار ہے، لیکن علم مفقود ہے۔ درجنوں علوم پر روزانہ، تمام زبانوں میں، کروڑوں بلکہ اربوں لفظوں کی اشاعت کا عمل پورے کرہ ارض پر جاری ہے۔ لیکن آگہی مفقود ہے۔ ذرائع ابلاغ زیادہ سے زیادہ اطلاعات، مگر کم سے کم معلومات فراہم رہے ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ:

Telling more and more about less and less

یہاں ٹی ایس ایلیٹ کا ایک مقولہ بھی یاد آ رہا ہے کہ:

Where is the wisdom we have lost in knowledge

Where is the knowledge we have lost in information

یوں علم اطلاعات کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمیں لفظ ”خبر“ کے معنی پر پھر سے غور کرنا ہوگا۔ اس لفظ کے معنی ہیں: واقفیت، آگاہی، پیغام، بتا، سندسیدہ، سراغ، نشان، شدہ بدھ، ہوش مندی، ہشیاری، احوال، اعلان، اطلاع، حدیث، شہرت، کسی واقعہ کو ظاہر، عیاں، یا آشکار کرنا۔ ”خبر کے ساتھ ایک اور لفظ بھی تھی ہے، جسے ”افواہ“ کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی غور طلب ہے۔ پوری دنیا میں آج کل جو لاکھوں ٹنوں کا غد صرف ہو رہا ہے، ریڈیو اور ٹی وی پر جو الفاظ بولے جا رہے ہیں، ان میں خبر کو دو الفاظ میں قید کر دیا گیا ہے: اطلاع (Information)، اور افواہ (Speculation)۔ یہی وجہ ہے کہ خبر سے علم اور آگہی غائب ہو چکے ہیں۔ موجودہ دور کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے علم کو خانوں میں تقسیم کر دیا ہے، اس عمل کا نام Specialization ہے۔ ہر شخص اپنے میدان کا اسپیشلسٹ ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر شخص ایک رخا ہو کر رہ گیا ہے۔ علوم کے علاوہ یہ معاملہ زبانوں کا بھی ہے۔ وہ دور گزر گیا جب سندھ کی سرزمین پر شاعر ہفت زبان سچل سرمست کے نغمے گونجا کرتے تھے۔ دور کیوں جائیے، ہم نے اپنے شاعر مشرق پر سینکڑوں کتابیں اور ہزاروں مضمون لکھوادیئے، لیکن ہمیں یہ یاد نہیں رہا کہ ان کے پیغام کا ساٹھ فی صد حصہ یعنی ان کا فارسی کلام ایسا ہے جسے نہ تو ہم صحیح طرح پڑھ سکتے ہیں، اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم سب یک رخ ہو کر رہ گئے ہیں۔

جب منظر نامہ ہی ایک رخا ہو جائے تو تو نظر بھی محدود ہو جاتی ہے۔ تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھائی دیتا ہے، اور وہ بھی ادھورا۔ نام نہاد ماہرین اپنے ہی محدود علم کی روشنی میں ان واقعات اور حادثات کا جائزہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جن کے عوامل اور محرکات کو سمجھنے کے لیے ایک سے زیادہ علوم پر دسترس ہونا ضروری ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ محدود علم اور محدود مشاہدے، محض محدود اطلاع اور محدود تجربے کو جنم دے سکتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں حقائق منخ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اخبارات کے کالم، خبروں، جائزوں، اور تجزیوں سے پر ہوتے ہیں۔ یہی اخبارات کا مقصد بھی ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے، ماسوا چند ایک کے، یہ سب تحریریں لفظوں کے گورکھ دھندے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ متفرق خیالات کے ربط اور ترتیب سے جو علم، آگہی، اور بالغ نظری پیدا ہوتی ہے، وہ سرے سے غائب ہے۔ خبروں کی اس بھرمار میں نہ صرف ہم بے خبر ہیں بلکہ دوسرے بڑے ناظم بڑی نا انصافی یہ ہو رہی ہے کہ نصف صدی کے بعد وہ مورخ کیا تاریخ مرتب کر سکے گا جس کا دار و مدار آج کے اخباروں، جریڈوں، اور کتابوں پر ہوگا۔ ہر مورخ کو اسی خام مواد سے اپنی تعمیر کرنی ہوتی ہے۔ جب خام مواد ہی ناقص اور ناقابل اعتبار ہوگا تو عمارت کی ساخت اور

سا کھ کیا ہوگی۔ یہ ہم سب پر عیاں ہے۔“

مندرجہ بالا سطور میں ضمیر نیازی کے اس طویل حوالے کا بنیادی مقصد، اس معیار، ذمہ داری، اور منصب کا تعین کرنے میں مدد حاصل کرنا ہے کہ جو سالہا سال سے کالم نگاروں کو نشان منزل دکھا رہا ہے۔

کالم نگاری کے منصب کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ہم اس کو بیانیہ یا narrative کی کس صنف میں گردانتے ہیں، اور اس بیانیہ کے معیار اور حدود و قیود کیا ہیں۔ غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اکثر کالم پیشہ ور صحافی لکھتے ہیں، جنہوں نے باقاعدہ طور پر صحافت کی پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کی ہوتی ہے۔ یہ کالم ظاہر ہے کہ صنف صحافت میں شامل ہیں۔ اخباری کالموں کی مختلف اقسام ہیں، جن میں ادارے، آراء، سیاسی تبصرے، کتابوں کے جائزے، فلمی جائزے، مذہبی مضامین، معاشی افکار، طرز زندگی پر تبصرہ، اور بے شمار موضوعات شامل ہیں۔ اخباروں میں چھپنے والے تقریباً سب کالم نگاروں کو حروف کی تعداد کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔ آج کل بالعموم کالم میں حروف کی تعداد سات سو سے آٹھ سو تک محدود ہو گئی ہے۔ اور صرف وہ کالم نگار ہی بڑا کالم نگار سمجھا جاتا ہے جسے مختصر نگاری پر عبور ہو۔

کالم نگاری پر ایک اہم کتاب، The art of Column Writing میں کالم نگاری سے متعلق وہ نکات بیان کیے گئے ہیں جن کو مد نظر رکھتے ہوئے عمدہ کالم نگار منفرد طور پر پہچانے جاتے ہیں اور اکثر اعزاز و انعام کے بھی مستحق قرار دیئے جاتے ہیں۔ ان اہم نکات میں، مضبوط اور باحوالہ دلیل، علم اور روشن خیالی، منفرد نقطہ نظر، ربط فکر، واضح خیالات، ایک عمدہ کہانی، معروضی تنقید، جذبات کی وسعت، نئی آواز، پیشہ ور اخلاقیات، اور صحافت کے قوانین کی پابندی شامل ہیں۔

جو باتیں کسی کالم کو کم تر یا اسفل درجہ پر لے جاتی ہیں ان میں، پھسپھسا پن، اکتاہت پیدا کرنے والے خیالات، گھسی پٹی ترکیبیں اور الفاظ، کالم نگار کا جا بجا اپنی ہی ذات کا حوالہ، پر دلیل رائے کا فقدان، مستند حوالوں کی غیر موجودگی، غیر معیاری زبان کا استعمال اور بازاری نعرہ بازی شامل ہیں۔

کالم نگاروں کی صفوں میں پیشہ ور صحافیوں کے علاوہ وہ ادیب اور مصنف بھی شامل ہوتے ہیں جو کسی دیگر شعبہ میں امتیاز رکھتے ہوں۔ اس قسم کی تحریروں کو اب ”تخلیقی غیر افسانوی ادب“ کی صنف قرار دیا جا رہا ہے۔ اس صنف کو اختیار کرنے والوں میں بڑے ادیب، دانشور، اور اصحاب رائے شامل ہیں۔ مغرب میں ان معروف ناموں میں، جورج اورویل، چارلس ڈکنز، ڈینیئل ڈیفو، ٹوم ولف، آرٹ بکوالڈ، فریڈز کریا، اور ایسے ہی بے شمار بڑے نام شامل ہیں، ہمارے لیے ان میں سامنے کا نام آرٹ بکوالڈ کا ہے جس نے اپنی زندگی میں کم از کم دس ہزار سے زیادہ کالم تحریر کیے۔ ہم یہ بات بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان مصنفین نے کالم نگاری، اور صحافت کو جس درجہ پر پہنچایا اور جو معیار متعین کر دیئے ان تک پہنچنے کی خواہش ہر نئے یا تجربہ کار کالم نویس کے ذہن میں ہمہ دم موجود رہتی ہے۔

خود اردو زبان اور پاکستان کی کالم نگاری کے معیار متعین کرنے والوں میں ابولکلام آزاد، چراغ حسن حسرت، جمیل احمد جالبی، منو بھائی، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، ابن انشا، مشفق خواجہ، شوکت تھانوی، کشورناہید، زاہدہ حنا، اور نسیم بنت سراج، کے نام سرفہرست ہیں۔

میری رائے میں پاکستان اور اردو زبان سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی کالم نگار مندرجہ بالا مصنفین کے طے کردہ معیاروں تک پہنچے بغیر، کبھی بھی بڑا کالم نگار نہیں گردانا جائے گا۔ اگر وہ ان کے معیاروں سے انحراف کرنا چاہے گا جو اس کا حق ہے تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ اس طے شدہ رفعت کو کسی بلند تر جست سے عبور کر کے اپنا نیا معیار متعین کروائے۔

میں اس موقع پر مناسب سمجھتا ہوں کہ پاکستان اور اردو کے ایک ممتاز ترین کالم نگار ”نصر اللہ خان“ کے اس انٹرویو سے استفادہ کروں جو انہوں نے ڈاکٹر طاہر مسعود کو دیا تھا، یہ انٹرویو طاہر مسعود کے مجموعہ ”یہ صورت گر کچھ خابوں کے“ میں شامل ہے۔

نصر اللہ خان سے سوال کیا گیا کہ ”ایک ایسے کالم کی کیا پہچان ہے؟ یعنی اس میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟ انہوں نے کہا کہ ”کالم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ آپ اس کے ذریعہ اپنے ملک و قوم کے مسائل کو حل کرنے میں لوگوں کی اس طرح مدد کریں کہ وہ سوچنے سمجھنے، اور کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔۔۔ لطیفے اور الفاظ سے کھیلنا، کسی کی محرومی کا مذاق اڑانا نہ کالم نویسی کے احاطہ میں آتا ہے اور نہ صحافت کے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے ایک بار شوکت تھانوی کا کسی معذور شخص کے بارے میں لکھا ہوا یہ خاکہ پڑھا کہ وہ یوں لنگڑا لنگڑا کر چلتے تھے جیسے ٹائپ کرتے ہوں۔ اس دن سے میں نے شوکت تھانوی کو پڑھنا چھوڑ دیا۔“

دوسری بات یہ ہے کہ کالم نگار کو اپنی ذات کو مار کر لکھنا پڑتا ہے۔ کالم نگار کو بے غرض ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب ہے کہ کلام نگار اپنا امیج نہیں بنائے۔ نصر اللہ خان سے سوال کیا گیا کہ، ”کالم نگاری کو ادب کی صنف تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ادیب کالم نگاری کو سطحی، چلتا ہوا اور صحافتی مشغلہ شمار کرتے ہیں، اور یوں اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ آپ ادیبوں کے ان خیالات کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اور آپ کے پاس اس کے جواب میں کہنے کے لیے کیا ہے؟

انہوں نے جواب میں کہا کہ ”یہ کالم نگار پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کالم کو چلتا ہوا کام بنا دے یا ہیرے کی طرح تراش کر رکھ دے۔ ہمارے پاس وقت کم ہوتا ہے اور عجلت میں لکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کئی ایسی چیزیں لکھ دی جاتی ہیں جو ادبی شدہ پارے پر بھاری ہوتی ہیں۔ کالم نویسی ادب کا حصہ ہے، صحافت کا ہر صفحہ تاریخ ہے۔ آپ معاشرے اور حالات زندگی پر لکھتے ہیں۔ اگر موضوع پر آپ کے لکھنے کا طریقہ ادبیانہ ہے تو اسے یقیناً ادب سمجھا جائے گا۔ ہر کالم ادب کا حصہ نہیں ہے۔ جیسے ہر غزل ادب کا حصہ نہیں ہے۔ اس کا دار و مدار وقت، موضوع اور لکھنے والے کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ اودھ پنچ میں جو کچھ چھپتا تھا، متن ناتھ سرشار کا فسانہ، آزاد جو اخبار میں چھپتا تھا، آپ کیا انہیں ادب کا حصہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے؟ اسی طرح میر محفوظ علی، اور قاضی عبدالغفار، عبدالجید سالک، چراغ حسن حسرت، اور ظفر علی خاں کی تحریروں کو کیا نام دیں گے۔ جو بہر حال ادب میں شامل ہیں۔ لکھنے والا ادیب ہے تو پھر کالم بھی ادب میں شمار ہوگا۔ نصر اللہ خان سے سوال کیا گیا کہ، ”کیا آپ لکھنے والوں کے پی آر کے رویے کو باجواز سمجھتے ہیں؟ جواباً انہوں نے کہا ”میں اس رویے کو کبھی بھی درست نہیں سمجھتا۔ خدا جانے لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ بعض لوگ اپنی بلبلی کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے بلبلی سے اس میں زور پیدا ہو جائے گا۔ میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ پھر نرس کر بولے ”آدمی اپنے ساتھ شام منانا چاہتا ہے تو شام غریباں منائے۔“

دس ہزار سے بھی زیادہ کالموں کے مصنف اور متعدد بار بہترین کالم نویس کا اعزاز حاصل کرنے والے نصر اللہ خان سے پوچھا گیا کہ، ”آپ کے کالموں کا مجموعہ بات سے بات مظہر عام پر آیا اور اس کے باوجود کہ بہت اچھا مجموعہ تھا، نہایت خاموشی سے گزر گیا، اس کا وہ شہرہ نہ ہو سکا، جس کا وہ مستحق تھا۔ آپ اس کے اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔ انہوں نے جواب میں کہا، ”میرے کالموں کے مجموعے کی ایک ہزار کاپی چھپی تھی۔ اس میں بیس سال کے کالموں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ لیکن میں اس انتخاب سے مطمئن نہیں ہوں۔ پھر یہ کہ مجھے کوئی پبلشر بھی نہیں ملا۔ حالانکہ میں تو اس پر بھی تیار تھا کہ پبلشر مجھے ایک پیسہ نہ دے لیکن کتاب ڈھنگ سے چھاپ کر عام آدمی تک پہنچا دے۔ لیکن یہ سب نہ ہو سکا۔“

کالم نگاری کی ضمن میں طاہر مسعود کا اردو کے ممتاز محقق اور دانشور مشفق خواجہ سے یہ سوال اور اس کا جواب بھی توجہ طلب ہے، ”پاکستان اور ہندوستان کے ادبی حلقے اور اخبارات کے ادبی صفحات کے قارئین کی ایک بڑی اکثریت ”خاموش بگوش“ نامی ایک کالم نگار سے واقف ہے، جس کے ادبی کالم کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اور جس کا ہر کالم ایک نئے تنازعے کا باعث بنتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ خامہ بگوش آپ ہی ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے اپنا نام پوشیدہ رکھ کر ایک قلمی نام اختیار کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔؟“ جواب میں مشفق خواجہ نے کہا کہ ”اصل میں کالم نگاری میرا میدان نہیں ہے۔ یہ میرا مقصد اور میری منزل نہیں ہے۔ میں قلمی نام سے اس لیے لکھتا ہوں کہ ہمارے ہاں فرضی ناموں سے لکھنے کی ایک طویل روایت ملتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سا لہا سال تک ’عنقا‘ کے عنوان سے لکھتے رہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے سندباد جہازی کے نام سے کالم نویسی کی۔ ابن انشانے کم از کم نو فرضی ناموں سے کالم لکھے، اور پطرس بھی فرضی نام تھا جو بالآخر اصل نام کا جزو بن گیا۔ قلمی نام اختیار کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ طنز و مزاح کے کلام میں بعض چیزوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اصل نام سے لکھنے میں یہ خرابی ہے کہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا لکھا گیا ہے بلکہ اس پر توجہ دینے لگتے ہیں کہ کس نے لکھا ہے۔ چونکہ میرے پیش نظر مقصد اہم تھا اس لیے میں نے فرضی نام اختیار کیا۔ اب یہ میری بد قسمتی ہے کہ کالموں کی اشاعت کے بعد لوگ اس تحقیق میں پڑ گئے کہ لکھنے والا کون ہے۔۔۔۔ جن ادیبوں کے متعلق میں نے کالم لکھے ان میں بعض بہت حساس تھے۔ ان کا یہی خیال تھا کہ میں نے کسی وجہ سے ان کے خلاف کالم لکھے۔۔۔ میں نے تقریباً رومنائی کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے کیوں کہ میں دیانت داری سے اسے ادب اور ادیب کے حق میں مضرت سمجھتا ہوں۔“

مشفق خواجہ ”خامہ بگوش کے قلم سے“ کے عنوان سے شائع ہونے والے اپنے کالموں کے مجموعہ میں لکھتے ہیں: ”کالموں کا انتخاب شائع کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ جس معاشرہ میں سبھی صاحب کتاب ہوں وہاں ایک آدھ کتاب خواں کا ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ کتابوں کی اشاعت بے جواز نہ ٹہرے۔۔۔ کالم نگاری ہم کئی سال سے کر رہے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمارے کالموں کی ضخامت ممتاز مفتی کے علی پور کے ایلی سے کم نہ ہوگی۔ اتنے بہت سے کالموں کا انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔۔۔ ان کالموں کو ہم نے جمع کیا اور ان پر ایک نظر ڈالی۔ اندازہ ہوا کہ سبھی سراپا انتخاب ہیں بشرطیکہ ناقابل انتخاب کالموں کا مجموعہ چھاپنا ہو۔۔۔ اس مرحلے پر اردو کے منفرد نقاد مظفر علی سید نے ہماری دستگیری کی۔۔۔ ہماری حوصلہ افزائی کے خیال سے انہوں نے فرمایا، کوئی مصنف اپنی تحریر کا انتخاب خود نہیں کرتا، کیوں اسے اپنی ہر تحریر عالم میں انتخاب اور آپ کو کالم میں انتخاب نظر آتی ہے۔۔۔ میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ اچھا کالم کونسا ہے اور برا کالم کونسا ہے۔ میں تو اس پر نظر رکھوں گا کہ کون سا کالم کم برا ہے اور کون سا زیادہ۔۔۔“

مجھے امید ہے کہ اب تک کے بیان کردہ مضمون سے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہو کہ کالم نگاری کا منصب کیا ہے، اور کالم نگاری کیسی صحرا نوردی اور کیسا فرہادی تیشہ طلب کرتی ہے۔ جیسے کہ غالب نے کہا تھا کہ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔

آپ اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ ایک مشاق اور تجربہ کار کالم نگار کے ذہن میں اس کے پڑھنے والے بھی ہوتے ہیں اور ایک ایسا نظریہ بھی کہ جس کے ذریعہ وہ سماج میں بہتر تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔ میں نے جن پاکستانی کالم نویسوں کا ذکر کیا ان میں ضمیر نیازی آزادی، صحافت کے رہنما تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ سخت جان لیوا کنسر میں مبتلا تھے جب انہیں بے نظیر بھٹو کی حکومت نے اعزاز سے نوازا تھا۔ انہوں نے اپنا سرکاری اعزاز اور اس سے منسلک رقم حکومت کو یوں لوٹا دیئے کہ اسی سال حکومت نے کئی اخباروں کے دفتروں پر شب خون مار کر پابندی لگائی تھی۔ ان سطور میں پیش کردہ سب ہی نام پاکستان میں اور عالم اسلام میں آزاد خیالی اور روشن خیالی کے خواہاں اور عمل پرست تھے۔

اب مناسب ہوگا کہ میں محترمہ روبینہ فیصل کی کتاب سے چند اقتباسات آپ کو پیش کروں تاکہ آپ خود یہ فیصلہ کر پائیں کہ ان کی کاوش ان معیاروں تک کہاں تک پہنچی ہے، جو اوپر بیان کیئے گئے ہیں۔ اور اگر انہوں نے انحراف کیا ہے جو ان کا حق ہے تو انہوں نے ان معیارات سے آگے کی کیا حد قائم کی ہے۔ آپ ان اقتباسات میں کوئی نقطہ نظر بھی تلاش کر سکتے ہیں۔

مری زمیں کے لیے تھا مثال ابر کرم میں وہ قائد اعظم کے بارے میں لکھتی ہیں ”(وہ) اپنے نوکر کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔“ پاک بھارت تعلقات کے بارے میں اپنے کالم یاد کیا تجھ کو دلائیں تراپیاں جاناں“ کے عنوان سے انہوں نے لکھا ہے، ”کیا کبھی بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے دوست ہو سکتے ہیں، سوچئے۔۔۔ سب رسمی ہو، سب ڈھول تماشوں کو سب ظاہری بینڈ باجوں کو چھوڑ کر بس سوچئے سچے دل سے۔ اپنے خداؤں کو حاضر ناظر جان کر مان کر سوچئے کیا ایسا ممکن ہے؟ میرا دل کہتا ہے نہیں!“ ”پاکستان اور انڈیا کے لوگوں میں تعصب کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ یہ کسی میرا کے بھارت جانے یا ہمیش بھٹ کے پاکستان آنے سے ختم نہیں ہو سکتیں۔ انڈیا کی پاکستان کے خلاف بنی فلمیں دیکھ کر کوئی مہ وطن، نارٹ انسان اپنا بلڈ پریشر کنٹرول نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ انہی کی کسی ادا کارہ کا اچھا سا رقص نہ دیکھ لے۔۔۔ ہماری عوام پیار کرنے والی ہے اور سادہ دل ہے وہ اپنے اندر نہ کمیٹنگی پال سکتی ہے نہ کسی کی کمیٹنگی آسانی سے سمجھ سکتی ہے۔۔۔ مگر انڈیا کے اندر جو جڑوں تک پھیلا زہر ہے تعصب کا، حقارت کا، احساس کمتری یا حسد کا، چھوٹے بھائی کو کونٹوں میں پھینک کر باپ (امریکہ) اور پوری دنیا کو اس بھڑکے خون سے بھری قمیص دکھا کر جھوٹا ڈرامہ کرنے کا شوق۔“

آزادیء اظہار کے بارے میں اپنے کالم ”محبت آزادی مانگتی ہے“ میں روبینہ لکھتی ہیں، ”آزادیء اظہار، اس کا تانتا اپنے عالم فاضل بھائی بندوں کا اسلام اور پاکستان کے خلاف زہرا لگنے ہی پر کیوں ٹوٹتا ہے؟۔۔۔ مگر یہ آزاد خیال، بڑے بڑے دانشور، انسانیت نواز، اپنی عقل سے دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی کا دل دکھانے کا باعث بنتے ہیں، اور پھر کہتے ہیں ہم انسانیت سے محبت کرتے ہیں۔ یہ کیسی انسانیت ہے کہ جب آپ کا منہ کھلے لوگوں کا دل اندر سے ہل جائے، کیونکہ کہ کبھی تو آپ ان کے پیارے مذہب کو، ان کے نبی کو۔ ان کے رب کو، ان کی ثقافت کو اور کبھی ان کی دھرتی ماں کو کوٹیں۔۔۔ اور یہ اپنے ہی عالم فاضل لوگ کہتے ہیں،

